(اس کتاب میں کیرکٹر اصلی ہیں لیکن نام فرضی ہیں)
(تین مقدّس ہستیاں)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

از

نیاز فتحپوری

جسے

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نے

باہتمام سید توسل حسین

یونائیٹڈ انڈیا پریس نیا گاؤں لکھنؤ

میں چھپوایا

بار دوم ۲۰۰۰ جلد ۱۹۴۲ء قیمت ۸/

انسان فطرتاً بہت ظاہر پرست واقع ہوا ہے۔ وہ ایک چیز کی سطح کے سوا بطون کا ادراک کرنا ہی نہیں چاہتا اور ہے بھی یہی کہ جو چیز جتنی دور ہوتی ہے اُسی قدر وہ زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے قریب آئی اور ساری رنگینیاں خاک میں مل گئیں

چاند اسی لئے روشن نظر آتا ہے کہ وہ ہم سے دور ہے، شفق اسی لئے رنگین دکھائی دیتی ہے کہ وہ ہم سے قریب نہیں اور خود اپنا کرۂ ارض اپنے کو تاریک نظر آتا ہے کیونکہ وہ ہم سے بالکل متصل ہے۔ مریخ والوں سے زمین کی درخشانی کا حال پوچھو، اور چاند میں جا کر دیکھو کہ وہاں کیا ویرانی ہے۔

ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں اور اس کی ظاہری وضع و قطع سے متاثر ہو کر اس کے اخلاق و عادات کے متعلق ایک قطعی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اگر اس کی ظاہری حالت ہماری معاشرت و

تہذیب کے مقررہ معیار پر ٹھیک اُترتے ہیں تو ہم حکم لگا دیتے ہیں
کہ وہ مہذب و شائستہ ہے، ورنہ اس کو وحشی سمجھ کر منھ پھیر لیتے
ہیں، حالانکہ ہمارے قائم کئے ہوئے معیار خود انھیں ظاہر پرستیوں
سے پیدا ہوئے ہیں۔
احمد بہت مقدس ہے کیونکہ اُس کی صورت و وضع اس کی
شاہد ہے۔ محمود اوباش ہے کیونکہ اُس کا ملبوس رندانہ ہے۔
یہ ہے مختصر سا نظریہ جس پر انسان کاربند نظر آتا ہے، اور یہ ہے
وہ اصول جس نے حقیقت کی طرف سے دنیا کو غافل کر رکھا ہے
اور ژرف نگاہی کو معطل و بے کار۔
یاد رکھو کہ "جلد متاثر ہو جانا" دوسرے کو غیر متاثر رکھنا ہے،
حالانکہ عالم کا کاروبار اسی پر منحصر ہے کہ ہم اپنے آپ کو "مؤثر"
ثابت کریں، قبل اس کے کہ کوئی رائے کسی کے متعلق قائم کرو،
کافی غور کر لو، پوری تحقیق صرف کر دو، کیونکہ "حس کا جمود" یا احساس کا
سکوت" اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ گمراہ ہو جائے
ضرورت ہے کہ ہر چیز کا مطالعہ اس کے حجابات دور
کرنے کے بعد کیا جائے، ورنہ اکثر و بیشتر انجام میں تھیں اپنے
آپ کو ملامت کرنا پڑے گی، آؤ میں تھیں چند واقعات

ایسے سُنائوں جن سے تم کو معلوم ہو کہ ہماری بعض سمجھی ہوئی
حقیقتیں "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" کیا نظر آتی ہیں

نیاز فتحپوری
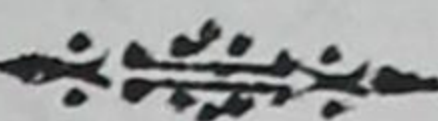
مولانا وارث علی اور اُن کی بیوی

(۱)

مولانا وارث علی کاظمی چشتی قادری مدظلہ، فنون ظاہری کے مشہور عالم اور علوم باطنی کے بےمثل ماہر تھے۔ سر کے شملہ سے لیکر (جو ہمیشہ کبھی "مقدار علم" سے زیادہ نظر آتا تھا) پاؤں کے جوتے تک زہد و تقدس کی تصویر تھے اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ دانۂ تسبیح کی گردش کا ساتھ اُن کے "سریع السیر" ہونٹوں نے چھوڑ دیا ہو۔ ہمارے ایک دوست کا خیال تھا کہ اُن کے ذکر و شغل کی رفتار اس درجہ تیز تھی کہ مشکل سے اُن کی "تسبیح رانی" اور "لب جنبانی" کا فلم تیار ہو سکتا تھا۔ سر گھٹا ہوا، مونچھ منڈی ہوئی، سارے سینہ پر سایہ کئے ہوئے گھنی داڑھی نیچا کُرتہ، اونچا پاجامہ، شانہ پر پڑا ہوا رومال، لانبی جریب، یہ تھی اُنکی وردی اور اُس کا "لوازمہ" جس سے جدا وہ کبھی نظر نہیں آئے۔

پانچوں وقت جماعت کے ساتھ محلہ کی مسجد میں نماز ادا کرنا، امامت کرتے وقت ہمیشہ "القارعۃ" اور "اذا زلزلۃ" کی سورتوں میں آواز کو گریہ آلود

کرلینا، نماز کے بعد دیر تک رو رو کر دعائیں مانگنا، خطبہ و وعظ میں بہت سی حکایتیں اکابر اُمت کی بیان کر کے لوگوں کو ہمدردی، صلۂ رحم، رواداری اور ایفائے عہد کی طرف راغب کرنا، سارا رمضان اعتکاف میں بسر کر دینا، پانی پھونک کر مریضوں کو دینا، گنڈا تعویذ تقسیم کرنا، ہر شخص سے نہایت نرمی و محبت کے ساتھ گفتگو کرنا، یہ تھا اُن کے اخلاق کا عالم جس سے شہر کا ہر متنفس واقف تھا۔

گھر کا مکان تھا، بیوی رکھتے تھے اور دنیا کی ضرورتوں سے بے نیاز نہ تھے لیکن کسی کو خبر نہ تھی کہ ذریعۂ معاش کیا ہے؟ کوئی کہتا تھا کہ اُن کے پاس دست غیب ہے، کوئی اس کو محض توکل کے برکات بتاتا تھا، بعض بے دین منافقوں کا خیال یہ بھی تھا کہ مریدوں کی جماعت بہت بڑی ہے وہ مدد کرتے ہیں۔ یا جب سال میں چھ ماہ کے لئے باہر دورہ پر جاتے ہیں تو وہاں سے تحائف و ہدایا کی صورت میں اتنی رقم لے آتے ہیں کہ دوسری ششماہی کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ بہرحال واقعات جو کچھ ہوں، وہ تھے مرد مقدس اور اپنے تمام اطوار و افعال کے لحاظ سے ضرور اس قابل تھے کہ اُن کے سامنے دست ارادت بڑھا دیا جائے اگر کسی کو ضرورت ہو۔

میں درویشوں اور مولوی منشوں کی طرف سے بہت بدظن ہوں

لیکن اُن کے ساتھ مجھے بھی حُسن ظن تھا، اور جب کبھی راستے میں ملجاتے تھے تو ضرور مؤدبانہ طور پر سلام کر کے پوچھ لیا کرتا تھا کہ "حضرت کا مزاج کیسا ہے"؟

ایک زمانہ گزر گیا اور مولانا موصوف کی شہرت بدستور اپنا حلقہ وسیع کرتی رہی، اور چونکہ میں انھیں کے محلّہ میں رہتا تھا اسلئے مجھ پر اور زیادہ اثر قائم ہوتا رہا

ایک دن صبح کی ڈاک میں مجھے ڈاک خانہ کا ایک مستطیل لفافہ ملا اور بغیر اس امر پر غور کئے ہوئے کہ کس کے نام تھا میں نے کھول لیا اندر ایک خط تھا جس پر ڈیڈ لیٹر آفس کی چٹ لگی ہوئی تھی کہ "مکتوب الیہ نہیں ملا فرستندہ کو واپس کر دیا جائے"۔ یہ دیکھ کر لفافہ کے پتہ پر غور کیا تو اس پر "مولانا وارث علی کی بیوی" لکھا تھا اب میں سمجھ گیا کہ اصل خط مولانا وارث علی کی بیوی کا تھا، جسے انھوں نے کسی کے نام لکھا تھا جب وہ نہیں ملا تو ڈاکخانہ سے اُن کے پاس واپس کر دیا گیا اور ڈاکیا غلطی سے مجھے دے گیا

میں نے یہ معلوم کر کے لفافہ بند کر دیا کہ کسی وقت اُن کے پاس بھجوادونگا لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ مجھ پر اس کے کھول لینے کا الزام نہ عائد کریں، میں نے چاہا کہ خط کی اہمیت کا اندازہ کر لوں اور جب اس کو

دوبارہ کھول کر ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تو میں مجبور ہو گیا کہ شروع سے انیخیر تک اسکا غائر مطالعہ کروں۔ چونکہ وہ خط بجنسہ یہاں درج کئے دیتا ہوں اس لئے کسی مزید نقد و تبصرہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

خط شروع ہوتا ہے :۔

"پیاری بہن! تم کہتی ہو گی کہ میرے خط کا جواب بھی نہ دیا، لیکن تم میری جگہ ہو تیں تو معلوم ہوتا کہ یہ خط بھی کس مصیبت سے لکھ رہی ہوں خدا جانے کس طرح محلہ والی سے قلم کاغذ وغیرہ منگوایا ہے، جب کہیں جا کے تہجد کے وقت لکھنے کا موقع ملا ہے، تہجد کا وقت اس لئے کہ وہ مسجد تشریف لے گئے ہیں اور صبح تک کیلئے مجھے آزادی کے ساتھ سانس لینے کی مہلت ملی ہے۔

تمھیں یہ قصّہ نہ معلوم ہوگا کہ اُس دفعہ جب تمھارا خط آیا اور میں نے اُس کا جواب لکھا تو اتفاق سے اُن کی نظر پڑ گیا، اور اُسی وقت سے لکھنے پڑھنے کا سارا سامان مقفل ہو گیا ہے اور سخت تاکید کر دی گئی ہے کہ " تم دنیا میں کسی کے نام کوئی تحریر نہیں بھیج سکتیں (یہ انھیں کے الفاظ ہیں) گویا آخرت میں مجھے اختیار ہے کہ جس کو چاہوں مخاطب کروں! بہن کیا بتاؤں کیسے انسان سے واسطہ پڑا ہے، میں ہی ایسی

بے غیرت ہوں جو دس سال سے اس مصیبت کو جھیل رہی ہوں، کوئی اور سی ہوتی تو کب کی لعنت بھیجکر چلی گئی ہوتی، سچ ہے کہ شریف عورتوں کا یہ دستور نہیں کہ خاوندوں کی برائیاں کریں، لیکن خدا کے لئے یہ بتاؤ کہ شریف مردوں کو کب یہ لازم ہے کہ اپنی بیویوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالیں

خدا جانے وہ کونسی منحوس ساعت تھی جب میرے بھائی نے (خدا اُن کی رُوح کو نہ شرمائے) مارے عقیدت و ارادت کے مجھے ان کے سپرد کر دیا اور پھر اتنی جلدی منہ موڑ گئے کہ میری تباہی کی داستان بھی نہ سُن سکے۔ ماں باپ پہلے ہی رخصت ہو چکے ہیں، اب دنیا میں کون ہے جس سے اپنا دکھ بیان کر کے ہمدردی کی توقع کر وں، تم کو کبھی کبھی لکھ دیتی ہوں کہ کچھ اسی طرح دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ ورنہ وہ تو مجھے معلوم ہے کہ یہ شخص جو بڑا "روح القدس" بنا پھرتا ہے، میرے حق میں عزرائیل سے کم نہیں، اور میری جان لئے بغیر نہ رہے گا، اور جان جانے میں اب رکھا ہی کیا ہے چار مہینے سے حرارت قائم ہو گئی ہے، کھانسی بھی رات کو آتی ہے، لیکن ضبط کرتی ہوں، ایک دن تیل کے بیگن کھا لئے تھے اور ایک

روز ایسی ہی چیزیں نصیب ہوتی ہیں۔ بکری کا
دن کیا ـــــــ
سالن مع دیگچی کے اُن کے سامنے چلا جاتا ہے اول آدھ پاؤ
گوشت ہی کیا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا بھی شریک ہو سکے، اس پر
سنت کی پیروی کا خیال "لکہ میں جھاڑ دینے کی عادت"
خدا معلوم ظالم کس ترکیب سے صاف کرتا ہے کہ دیگچی کی
قلعی تک اُڑ جاتی ہے ـــــــ ہاں تو ایک دن تیل کے بیگن
کھا لئے تھے، جس کی وجہ سے رات کو کھانسی زیادہ آئی حضرت
کو معلوم ہے کہ بخار بھی آتا ہے اور کھانسی بھی پرانی ہو گئی ہے
لیکن اس بیدردی کو دیکھئے کہ بھپرتے ہوئے کمرے سے نکلے
اور بولے کہ "میرا گھر اسپتال نہیں ہے جو ہر وقت تم کھوں کھوں
کیا کرو، تم کو ذرا خیال نہیں کہ ابھی ابھی وظیفہ پڑھ کے لیٹا ہوں
اور پھر تین بجے صبح تہجد کے لئے اُٹھنا ہے اگر دو گھنٹہ بھی
آرام سے نہ سوؤں گا تو زندگی کیسے ہو گی"۔ میں نے یہ سُن کر
عرض کیا کہ "کھانسی پر تو مجھے اختیار حاصل نہیں ہے" یہ سُننا
تھا کہ جامہ سے باہر ہو گئے اور بولے کہ "مجھے تو یہ اختیار حاصل
ہے کہ کل تمھیں شفاخانہ پھنکوا دوں، اور اس مصیبت سے نجات
حاصل کروں، خدا جانے میری کن بداعمالیوں کی سزا ہے کہ

ایسی نابکار عورت سے واسطہ پڑا ہے"۔ اس کے بعد وہ اور زیادہ مغلظات پر اُتر آئے اور میں منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اس کے بعد خدا جانے کس وجہ سے (شاید اس لئے کہ میں پھر لیٹی نہیں یا کسی اور سبب سے) کھانسی نہیں آئی، صبح جو اُٹھ کر باہر نکلے تو فرمایا کہ "وہ تو میں سمجھتا تھا کہ قصداً مجھے تکلیف پہونچانے کے لئے گلا پھاڑا جا رہا ہے، ورنہ کیا وجہ ہے کہ پھر کھانسی نہیں آئی"۔ یہ کہہ کر باہر جانے لگے اور نادری حکم سُنا گئے کہ آٹھ بجے تک کھانا تیار ہو جائے، اُٹھی تو سارا بدن پھُنک رہا تھا، سر میں شدید درد تھا لیکن مرتی کیا نہ کرتی، اُٹھ کر جلدی جلدی جھاڑو دی، برتن مانجے چولھا جلایا اور کسی نہ کسی طرح مقررہ وقت تک کھانا تیار کرنا ہی پڑا یہ ہے اُن ہزاروں باتوں میں سے ایک ادنیٰ سی بات جنھوں نے مجھ میں گھُن لگا دیا ہے۔ جب سُنتی ہوں کہ شہر میں فلاں شخص فالج سے فوراً مر گیا، کسی کی قلب کی حرکت بند ہو گئی اور ٹھنڈا ہو گیا تو کس حسرت سے کہتی ہوں کہ خدایا میں ان میں سے کسی ایک مرض کے بھی قابل نہیں ہوں، کیا تیرے لئے یہ بھی دشوار ہے کہ مکان کی چھت مجھ پر گرا دے، کپڑوں میں آگ لگا کر مجھے ہلاک کر دے، سانپ کو حکم دے کہ مجھے آ کر ڈس لے، لیکن دعا قبول نہیں ہوتی، سسک رہی ہوں

اور نہیں کہہ سکتی کہ کب اس عذاب سے نجات نصیب ہوگی

تم سمجھتی ہوگی کہ شاید میں کام سے گھبراتی ہوں، مجھ سے خدمت نہیں ہو سکتی، لیکن یقین کرو کہ اس وقت تک کبھی میرے دل میں بھی یہ خیال نہیں آیا، کہ مجھے کام سے جی چرانا چاہیئے، کیونکہ تمھیں معلوم ہے، میں یوں بھی کسی امیر گھر میں پیدا نہ ہوئی تھی اور وہاں بھی اسی قسم کے کام کی عادی تھی، لیکن فرق یہ ہے کہ وہاں مجھ سے کام لیا جاتا تھا عزیز جان کر، اور یہاں مجھ سے خدمت لی جاتی ہے لونڈی سمجھ کر، اگر دنیا میں خدمت کا عوض اتنا بھی نہیں مل سکتا کہ کوئی اس کا اعتراف ہی کر لے، تو میرے نزدیک کسی کو کسی سے کام لینے کا حق حاصل نہیں ہے، بہر حال میں محنت سے نہیں گھبراتی، اور نہ گھر کے کام میں کوئی ذلت ہوتی ہے، لیکن مجھے خفقان تو اس بدسلوکی سے ہے کہ وہ صرف چند پیسوں کے لالچ سے میری بیماری کا بھی خیال نہیں کرتے اور کسی خادمہ کے رکھنے کے روادار نہیں ہیں، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو ایک کیا دس آدمی نوکر رکھ سکتے ہیں، دنیا انھیں بوریہ نشین، متوکل، تارک الدنیا سمجھتی ہے، تو سمجھا کرے، اُسے کیا خبر کہ یہ توکل کا بندہ کتنے بڑے خزانہ کا خداوند ہے، اور اس موسنی صورت انسان کے اندر کتنا

عظیم الشان قارون چھپا ہوا ہے، اتفاق سے صرف سنٹرل بنک
کی پاس بک مجھے ایک دن مل گئی تھی اور میری حیرت کی انتہا
نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ بیس ہزار کی رقم تو اسی میں جمع ہے
یہ صرف ایک بنک کا حال ہے دوسرے بنکوں میں جو حساب ہے
اُس کا حال کسے معلوم۔

سال میں صرف دو جوڑے کپڑے مجھے ملتے ہیں اور پندرہ
روپیہ ماہوار کھانے کے خرچ کے لئے، جس میں دس بارہ اُنھیں
کے نذر ہو جاتے ہیں، تمھیں بتاؤ کہ زندہ رہنے کی کیا صورت ہے
گھر میں قدم رکھا اور تیوری چڑھی، مجھے دیکھا اور آنکھیں سُرخ
کرلیں، پھر اگر خدانخواستہ کوئی بات ذرا بھی خلاف مزاج ہو جائے
تو بس سمجھ لو کہ خیر نہیں۔ ایک دن کسی مرید نے بمبئی سے حلوے کا
پارسل بھیجا، مجھے حکم دیا کہ اسے احتیاط سے رکھ دو صبح دیکھوں گا
اتفاق سے مجھے جاڑا دیکر شدید تپ آگئی اور میں اس کی غفلت
میں کوٹھری کا دروازہ بند کرنا بھول گئی، جب صبح ہوئی اور
انھوں نے حلوا طلب کیا تو مجھے خیال آیا کہ کوٹھری تو بند ہی نہیں
ہوئی تھی، یقیناً بلی کھا گئی ہوگی اور یہی ہوا، اسوقت میری یہ
حالت تھی کہ خون خشک تھا اور بید کی طرح کانپ رہی تھی، جب

مجھے جانے میں دیر ہوئی تو خود آگئے اور پارسل کو کھلا ہوا اور
برتن کو خالی دیکھ کر جس بُری طرح پیش آئے اسکا بیان اب میں
کیا کروں، مختصر یہ کہ چار دن تک نیل کے نشان میرے بدن
سے دور نہیں ہوئے۔

شہر میں حضرت کے توکل کی دھوم ہے، حالانکہ مجھے معلوم ہے
کہ یہ حریص کس طرح لوگوں کے حقوق تلف کر کے روپیہ جمع
کر رہا ہے اور کن کن ترکیبوں سے دنیا کو فریب میں مبتلا کرتا ہے
متوسط طبقہ کے لوگوں سے گنڈے تعویذ کا نذرانہ عمل پڑھنے کا
خرچ، دعا کرنے کی شیرینی، چلّہ کشی کی نیاز، بزرگوں کا توشہ،
ایک ایسا بہانہ ہے کہ اس سے کافی رقم ہاتھ آجاتی ہے، اور
جو لوگ جاہل ہیں اُن میں کسی سے کہتا ہے کہ خاص قسم کے سفید
مُرغ کا خون چاہیئے، کسی سے کڑک ناتھ مرغی کی فرمائش کرتا
ہے، بعض سے اُلّو کے ناخن طلب کرتا ہے، اور جب وہ یہ
چیزیں فراہم نہیں کر سکتے تو کہتا ہے کہ اچھا میں خود ہی فراہم
کرلوں گا اور اس کے عوض میں اُن سے کافی رقم وصول کر لیتا
ہے۔ مہینے میں کم از کم تین چار نیمے بمبئی اور رنگون سے صرف
اسی مکر و فریب کے صدقہ میں وصول ہوتے ہیں اور کوئی بیمہ

سو روپیہ سے کم نہیں ہوتا، کلکتہ کا ایک مُرید حج کو گیا اور پانچ ہزار کی رقم اُن کے پاس امانت رکھ گیا، چلتے وقت کہہ گیا کہ اگر میں زندہ واپس نہ آؤں تو یہ رقم میری بیوہ کو پہونچا دیجائے۔ روانگی کے چوتھے مہینے تار آیا کہ "میں سخت بیمار ہوں، روپیہ بذریعہ تار بھیجدیا جائے"۔ لیکن روپیہ بھیجنا کیسا اِس احمق مرید کے عقلمند پیر نے یہ بھی نہ پوچھا کہ تو ہے کون؟ آخر کار وہ غریب مرگیا، بعد کو اُس کی بیوہ نے لکھا کہ "مجھے روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ اب میرا کوئی کفیل نہیں ہے"۔ لیکن پیر صاحب نے کوئی جواب نہ دیا، اُس نے پھر خط لکھا، ادھر سے پھر سکوت اختیار کیا گیا، آخر مجبور ہو کے وہ خود آئی، پیر صاحب نے اس کا سارا حال اس طرح سُنا گویا آج ہی اُن کو اس کے شوہر کی موت کا علم ہوا ہے اور کامل ایک گھنٹہ تک اُس کے ساتھ روتے رہے لیکن جب سوال روپیہ کا آیا تو صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اُس نے جو رقم امانت رکھی تھی وہ اس کو بھیجدی گئی اور ثبوت میں اُس کا وہ تار پیش کر دیا جس میں اُس نے اپنا روپیہ تار کے ذریعے سے طلب

کیا تھا، وہ غریب بیوہ کیا کر سکتی تھی، خاموش ہو گئی اور اپنا زیور بیچ کر گھر واپس گئی۔

عام طور پر شہر میں مشہور ہے کہ پیر صاحب کسی سے کچھ نہیں لیتے، اور یہ واقعی ایک حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ بظاہر اُن کا وتیرہ شہر کے اندر یہی ہے لیکن یہ حال کسے معلوم کہ جب نتھومل بزاز سے فیروزہ جان روٹھ جاتی ہیں تو پھر اُس وقت کوئی تعویذ بغیر دو سو روپیہ نذرانہ کے نہیں لکھا جاتا جس میں سے نصف رقم فیروزہ کے پاس پہونچتی ہے اور نصف پر یہ بزرگ قابض ہوتا ہے، نتھومل حیران ہے کہ اِدھر پیر صاحب نے تعویذ لکھا نہیں اور اُدھر فیروزہ پہونچی نہیں، لیکن اس بیوقوف کو کیا علم کہ کس طرح یہ دونوں مل کر اُسے لوٹ رہے ہیں۔

پرسوں کی بات ہے کہ بمبئی سے کسی سیٹھ کا خط آیا، اس میں لکھا تھا کہ "آپ نے اسی زمانہ میں چلہ کھینچنے کا وعدہ کیا تھا، معلوم نہیں شروع کیا یا نہیں، خدا کے لئے رحم کیجئے اور جلد اُس عمل کو پورا کیجئے کیونکہ فراق کے مارے دم نکلا جا رہا ہے اور کوئی صورت کامیابی کی

نظر نہیں آتی"۔

میرے پاس آئے اور کہا کہ اپنی طرف سے جواب لکھ دو کہ "پیر صاحب آپ ہی کا کام کر رہے ہیں اور چلّے کے بیس دن پورے ہو چکے ہیں، چونکہ یہ چلّہ اُنھوں نے نہایت سخت کیا ہے اور کسی سے بات بھی نہیں کرتے، اس لئے میں اُن کی طرف سے جواب لکھ رہی ہوں، یقین ہے کہ فاتحہ کے بعد مقصود پورا ہو جائے گا، نذرانہ جلد آنا چاہیئے تاکہ توشہ وغیرہ کا انتظام کیا جائے"۔

اب دیکھنا دو ہی چار دن کے اندر کئی سو کی رقم وہاں سے آجائے گی۔ الغرض کہاں تک بیان کروں، چوبیس گھنٹہ میں ایک گھنٹہ بھی ایسا نہیں گزرتا کہ وہ مکر وفریب کی فکر سے غافل رہتا ہو۔ یہ مسجد میں جاکر نمازیں پڑھنا، وعظ کہنا، اعتکاف کرنا، روزے رکھنا، سب گویا اسی کاروبار کی ترقی کے لئے ہے، ورنہ مجھے معلوم ہے کہ اُس کے زہد وتقویٰ کی کیا حقیقت ہے، یہ رات بھر خرّاٹے لے کر سونے والا شب زندہ دار، یہ بدہضمی کی حد تک پیٹ بھر کے روزہ رکھنے والا دیندار، یہ گھر میں رہنے کے بعد

ایک وقت بھی نماز نہ پڑھنے والا نمازی، یہ ہزاروں کی امانت
ہضم کر جانے والا امین، یہ کبھی کسی سے سچ نہ بولنے والا
صادق القول انسان، میں اب تم سے کیا کہوں کہ کیا چیز ہے
جس وقت رات کو مارے بخل کے یہ اپنے سارے کپڑے
اُتار کر اور ایک کثیف سا بوسیدہ تہمد باندھ کر لیٹتا ہے اور
پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر دن بھر کی وصول کی ہوئی رقموں کے
"انہضام" کا جائزہ لیتا ہے، تو اس کی صورت اس درجہ مکروہ
اور اس کا چہرہ اس قدر ڈراونا معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت
میں کانپنے لگتی ہوں۔ جس وقت یہ صبح کو اُٹھ کر باہر جاتا ہے
تو پورا ایک گھنٹہ وضع وصورت بنانے میں صرف کر دیتا ہے
لیکن باوجود اس اہتمام کے بھی چہرہ کی شقاوت و دنائت کسی
طرح نہیں چھپتی، خدا معلوم دنیا اندھی ہے یا کیا کہ وہ اس کو
محسوس نہیں کرتی اور اُس کے مکر کا شکار ہو جاتی ہے۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جن کو میں لکھ سکتی ہوں، لیکن اگر میں
اس ظالم کے اس اخلاقی پہلو کا حال بیان کروں، جسکی صراحت
ایک عورت ہونے کے لحاظ سے میں کسی طرح نہیں کر سکتی تو
دنیا حیران و ششدر رہ جائے۔ مکان کے جس حصّہ میں یہ رات

بسر کرتا ہے وہ زنانخانہ سے بالکل علیحدہ ہے بیچ میں
ایک دروازہ حائل ہے، جس کو وہ بند کر دیتا ہے، مجھے
نہیں معلوم کہ رات کو وہاں کون کون آتا ہے اور یہ شخص کیا
کرتا ہے۔ ایک رات چاندنی کھلی ہوئی تھی بارہ بج چکے تھے
کہ دفعتہً یہ دروازہ کھلا اور بقر عیدی کنجڑے کی بیوی جو محلّے ہی
میں رہتی ہے، گھبرائی ہوئی نکلی اور میری چارپائی پر آکر گر گئی
میں چونک پڑی اور پہلے تو یہ سمجھی کہ کوئی چور ہے، لیکن بعد کو
جب اُسے پہچانا تو حیران رہ گئی کہ کیا بات ہے، آخر کار بڑی دیر
میں اُس نے اپنی ساری داستان بیان کی جسکو سُن کر میں اُسکے
قدموں پر گر پڑی اور بولی "بہن ہماری عزّت و آبرو تمہارے
ہاتھ ہے، خدا کے لئے اب کسی سے یہ واقعہ بیان نہ کرنا"۔ وہ
شاید یوں بھی شرم کے مارے کسی سے کچھ نہ کہتی، لیکن میری
منت سماجت کا بھی اُس پر بہت اثر ہوا اور اس نے وعدہ کیا
وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرے گی، صبح ہوتے ہی میں نے اُسے
دوسرے دروازہ سے باہر کر دیا، اور پھر اُس نے کبھی اسطرف کا
رُخ نہیں کیا، اس کا علم تو مجھے بالکل اتفاق سے ہو گیا، کیونکہ یہ
عورت مجھے جانتی تھی اور ہے بھی نہایت نیک اور باحیا، ورنہ

کسے خبر ہے کہ رات کے وقت کس کس کو گنڈے تعویذ تقسیم ہوتے ہیں۔

تم سمجھ سکتی ہو کہ جب حالات ایسے ہوں تو میری زندگی کس طرح بسر ہوتی ہوگی اور میں کب تک زندہ رہ سکتی ہوں، مجھے یقین ہے کہ موت مجھ سے دور نہیں ہے اور وہ وقت میرے سامنے نہ آئے گا جب دنیا پر ان حقیقتوں کا انکشاف ہوگا، اس لئے یہ مختصر سا حال تمہیں لکھے دیتی ہوں، تاکہ اگر کبھی تمہارے سامنے یا تمہارے علم میں مولانا شاہ وارث علی" قدس سرہ العزیز" کی سوانحعمری مرتب ہو (اور یقیناً دنیا ایسے بزرگ کے حالات ضرور مرتب کرے گی) تو اس کتاب کے ایک گوشے میں میری یہ تحریر بھی درج کرا دینا تاکہ مولانا کی روح اس خیال سے مضطرب نہ رہے کہ اُن کی سیرت مکمل نہیں لکھی گئی"۔

بدقسمت

صغرا

خواجہ مسرور شاہ نظامی اور صفیہ

خواجہ مسرور شاہ کی زندگی کا ابتدائی زمانہ جس ماحول میں گزرا وہ باعتبار اپنے علم وفضل کے خواہ کیسا ہی تاریک کیوں نہ ہو، لیکن درویشی وتصوف کے لحاظ سے ضرور اس میں وہ تمام اسباب مہیا تھے جو ایک شخص کو ہر طرح سے پیر کامل بنا سکتے ہیں۔ اُن کے باپ خواجہ منصور شاہ ایک مشہور خانقاہ کے متولی تھے، نذر ونیاز کی رقم کا حساب کتاب بھی انھیں کے پاس رہتا تھا۔ یوں تو بہت سے مجاور اس آمدنی کے حصہ دار تھے لیکن یہ اپنے ریاضی داں دماغ کی بدولت خانقاہ کی آمدنی تمام شرکا میں تقسیم کرنے کے بعد بھی بہت کچھ اپنے لئے بچا رکھتے، علاوہ اس کے اُن کا حلقۂ ارادت وبیعت بھی کافی وسیع تھا، اور شاید ہی کوئی منحوس دن ایسا ہوتا ہو کہ دو چار ارادت مند اِدھر اُدھر سے آکر کچھ نہ کچھ بطور نذر کے پیش نہ کرتے ہوں، ہر جمعرات کو خانقاہ میں جلسۂ سماع

مرتب ہونا، دور دور کے قوالوں کا یہاں حاضری دینا، شہر کی ہر رُو دار بازاری عورت کا نہایت ادب لیکن نمائشِ حسن و پندارِ شباب کی ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس میں شریک ہونا، اور پھر منصور شاہ کا سپید داڑھی اور نورانی صورت لیکر رقص "حال" میں مصروف ہونا، ——— یہ تھی وہ فضا جس میں خواجہ مسرور کی نشوونما ہوئی، چونکہ خواجہ مسرور فی الجملہ قبول صورت تھے اور اُن کی آنکھوں میں قدرت نے شروع ہی سے ایک مقناطیسی کیفیت ودیعت کردی تھی اس لئے جب اُن کے شباب کے ساتھ ساتھ اُن رعنائیوں میں بھی اضافہ ہوا جو دائرہ تصوف کے اندر ہی رہ کر پیدا کی جاسکتی ہیں تو تھوڑے دنوں میں بجائے منصور شاہ کے "مسرور میاں" کے پوچھنے والے زیادہ ہو گئے، اور جنس نازک کے ارادتمندانِ بازاری کا تو ہر وقت اُن کے حجرہ میں ہجوم نظر آنے لگا۔ معلوم نہیں بیٹے کی تربیت کا خیال تھا یا جذبۂ رشک کہ منصور شاہ نے "مسرور میاں" کو بارہا اس طرف توجہ دلانی چاہی، لیکن جب وہ اس حقیقت پر غور کرتے تھے کہ ہمارا تو پیشہ ہی یہ ہے اور پھر فتوحات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے تو خاموش ہو جاتے اور جب کبھی مجمع میں ذکر آجاتا تو کہتے ماشاءاللہ

مسرور میاں کی شب زندہ داریاں بہت بڑھتی جاتی ہیں، میں منع کرتا ہوں کہ اس قدر زیادہ محنت شاقہ نہ برداشت کریں کیونکہ سنت نبوی کے خلاف ہے لیکن ان پر تو اُن کے دادا کا حال زیادہ غالب ہے اور وہ اپنے ملفوظات میں پیشین گوئی کر ہی چکے ہیں کہ " میرا ایک پوتا میرے عہد کی یادگار ضرور قائم کریگا" اسلئے میں کیا کر سکتا ہوں، اللہ کی مرضی ہے، اپنے بندے کو جس کام کے لئے منتخب کرے، کیا عذر ہو سکتا ہے، بہرحال میرے دن تو ختم ہو گئے اللہ مسرور میاں کو خرم و آباد رکھے کہ انھیں کی ذات سے اس خانقاہ کی دیرینہ روایات قائم ہونیوالی ہیں"۔

مسرور میاں کے جوان ہونے اور خانقاہ کا کاروبار سنبھالنے کے چند دن بعد ہی منصور شاہ کا انتقال ہو گیا، اور مسرور میاں اُس گدّی پر خواجہ مسرور شاہ چشتی نظامی کی حیثیت سے رونق افروز ہو گئے۔

منصور شاہ ذرا قدیم خیال کے انسان تھے اور جاہل ہونیکے لحاظ سے ان کا حلقۂ اثر بھی ویسا ہی تھا، لیکن مسرور شاہ چونکہ نئی روشنی کی پیداوار تھے اور فی الجملہ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھے، اس لئے انھوں نے ذرا بلند سطح پر اپنا میدان عمل قائم کرنا چاہا، یقیناً یہ ارادہ بہت دشوار طلب تھا، لیکن مسرور شاہ کی فطری ذہانت اور فہم

سلیم نے جو قدرت نے اُن کے دماغ میں ودیعت کردی تھی نہایت آسانی سے تمام دشواریوں کا مقابلہ کیا اور دو چار سال کے اندر انھوں نے خاصہ اقتدار ملک میں حاصل کرلیا۔ اب اُن کی شہرت بستی کی چہار دیواری کے اندر محدود نہ تھی، بلکہ ملک کے ہر گوشہ میں ان کے جاننے والے، ماننے والے پیدا ہوگئے تھے اور دور دور سے ان کو دعوت دیجاتی تھی تاکہ وہاں پہونچ کر اپنے برکات درویشی سے فیضیاب کریں، چنانچہ یہ کبھی ایسی دعوتوں کو رد نہ کرتے، کیونکہ دعوت کا رد کرنا سنت کے خلاف ہے اور اپنے برکات درویشی سے لوگوں کو فیضیاب کرتے۔

مسرور شاہ، صاحب دل درویش ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ اُن کی آنکھ میں موہنی اور زبان میں سحر ضرور تھا۔ آنکھ میں آنکھ ڈال کر مسکراتے ہوئے اُن کا کسی سے بات کرلینا قیامت تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پتلیوں سے خاص قسم کی ٹھنڈی شعاعیں نکل کر دل و دماغ میں نشہ کی سی کیفیت پیدا کر رہی ہیں اور لبوں کی جنبش سے پیدا ہونے والا ہر لفظ روح کے لئے ایک مخصوص حلاوت ہے، صورت کے لحاظ سے بھی بدقسمت نہ تھے، اور صاف رنگ پر اُن کی کاکلیں، وسیع پیشانی، بڑی آنکھوں،

نمایاں ابروؤں پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں

جب کبھی وہ باہر سفر کرتے تو اکثر گیروا لباس اُن کے جسم پر ہوتا، اور اس میں شک نہیں کہ اُن کے منڈی ہوئی داڑھی مونچھ پر بہت کھلتا تھا

مسرور شاہ ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے، دو تین خادم ساتھ رکھتے اور اسباب سفر بھی نہایت مہذب و شائستہ ہوتا، پہلے سے تمام درمیانی اسٹیشنوں پر جہاں جہاں اُن کے مرید ہوتے ذریعۂ تار اطلاع دیدی جاتی اور وہ ہجوم کر کے آتے اور پھولوں کے ہار اور تحائف وغیرہ خدمت میں پیش کرتے۔ منزل مقصود پر تو خیر اہتمام ہونا ہی چاہیئے، ہمیشہ کسی شاندار کوٹھی یا ہوٹل میں قیام کرتے، دو چار وعظ فرماتے اور مریدوں کی تعداد میں کافی اضافہ کر کے کسی دوسری جگہ بڑھ جاتے۔

خصائل وعادات کے لحاظ سے مسرور شاہ بالکل بے عیب معلوم ہوتے تھے۔ پنجوقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا، روزے رکھنا صدقہ و زکوٰۃ دینا، رات کا اکثر حصّہ ذکر و شغل میں بسر کرنا، لوگوں کو ادائے حق کی تلقین کرنا، یہ تھے وہ مشاغل جن میں اُن کے اوقات بسر ہوتے تھے، اُن کے مخالفوں کو بھی اُن میں کوئی بات نظر نہ آتی

تھی سوائے اس کے کہ وہ عورتوں کو بھی مرید کرتے تھے اور پھر اُن سے کوئی پردہ نہ رہتا تھا۔ الغرض اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا اور مسرور شاہ کی کامیابیاں وسیع ہوتی رہیں

خورجہ کے رئیس چودھری حاتم الزماں کے ہاں اُن کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے - دوست احباب کا ہجوم ہے اور مسرور شاہ صاحب بھی ایک ہفتہ سے وہیں مقیم ہیں۔ چودھری صاحب کا سارا گھرانا شاہ صاحب کا مرید ہے اور شاہ صاحب کو بھی اتنی خصوصیت شاید ہی کسی دوسرے سے ہو، جتنی اس خاندان سے ہے گھر میں کسی سے پردہ نہیں ہے اور شاہ صاحب ایک محرم کی طرح اس گھر میں زندگی بسر کر رہے ہیں، چودھری صاحب کا بیٹا بدیع الزماں بھی (جسے شاہ صاحب ہمیشہ بدیعی کے محبوب نام سے پکارتے ہیں) کالج سے رخصت لیکر آگیا ہے اور خاندان کے دوسرے افراد کی طرح یہ بھی ان کی خدمت میں مصروف ہے ۔ رات کا وقت ہے سب لوگ کھانا کھا کر اپنے کمروں میں لحاف اوڑھ کر پڑ گئے ہیں، بالاخانہ کے ایک خوبصورت کمرہ میں چاء کا سماوار سنسنا رہا ہے عود سُلگ رہا ہے مخملی قالینوں پر آرائش کی مختلف چیزیں قرینہ سے چنی ہوئی ہیں،

مسہری پر ریشمی لحاف اور نرم نرم خوشنما جھالردار تکیے رکھے ہوئے ہیں
سرھانے مختصر سی میز پر شمع جل رہی ہے، سوائے بیچ کے تمام دروازے
بند ہیں جس کی خوبصورت چلمن سے ہلکی روشنی چھن چھن کر آرہی ہے،
شاہ صاحب مسند پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں اور صفیہ جس کی شادی
کی تقریب میں یہ اجتماع نظر آتا ہے سامنے پاندان کھولے شاہ صاحب
کے لئے پان بنا رہی ہے۔ شاہ صاحب نہایت غور سے پان بناتے
وقت اس کے ہاتھوں کی جنبش کو تھوڑی دیر تک دیکھتے رہے اور
بولے "صفیہ تمھیں معلوم ہے کہ پان کھانے سے زیادہ، تمھارا میرے
سامنے پان بنانا کیوں زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے"۔ صفیہ یہ سنکر شرما گئی
اور خاموش رہی، لیکن شاہ صاحب نے اپنا سلسلۂ سخن جاری رکھتے
ہوئے کہا کہ "تمھارا نہایت سبک انداز میں صرف دو انگلیوں کی مدد
سے چمچی پکڑنا اور باقی انگلیوں میں ترتیب وار خم پیدا کرکے چھنگلیا کو
اس طرح علیحدہ رکھنا گویا وہ بہت بیزار ہے قیامت کا منظر پیش
کردیتا ہے"۔

صفیہ نے یہ سن کر حد درجہ شوخی آمیز انفعال کے ساتھ اپنا ہاتھ
دوپٹہ سے چھپا لیا اور جلدی جلدی گلوری بنا کر تھالی میں رکھی اور سامنے
سرکادی، شاہ صاحب نے جن کے لئے یہ ادا اور زیادہ تباہ کن تھی دیکھا

.... اور غیر محسوس ٹھنڈی سانس لیکر گلوری اُٹھاتے ہوئے بولے۔ "کیوں صاحب، یہ گلوری ویسی تو نہیں ہے جس کو زہر عشق کی زبان میں "پان کل کے لئے لگاتے جائیں" کہتے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہے، کیونکہ یہ رات ایک تاریک سمندر ہے جس میں میرے نشاط زندگی کا آفتاب ہمیشہ کے لئے ڈوب جانے والا ہے کل تمہاری شادی ہوجائیگی اور تمہاری ان تمام اداؤں سے لطف اٹھانے والا، تمہاری صورت پر قربان ہونے والا، تمہارے جسم کی بھینی بھینی خوشبو سے مست ہونیوالا جو ہوگا، وہ میں نہ ہوں گا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ میں تم کو کبھی دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں"۔

صفیہ شاہ صاحب کی خدمت میں بہت گستاخ تھی اور وہ بھی نہایت آزادانہ گفتگو اس سے کیا کرتے تھے لیکن اُس کا رنگ بے تکلفانہ ہوا کرتا تھا نہ کہ عاشقانہ، آج اُن کے منہ سے اس قسم کی باتیں سُن کر اُسے تھوڑا سا تعجب ہوا، لیکن چونکہ وہ شاہ صاحب کی شاعرانہ خصوصیت سے بھی آگاہ نہ تھی، اس لئے اُس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ فقرے بھی ویسے ہی ہیں مگر اک ذرا گہرا رنگ لئے ہوئے لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئی، وہ شاہ صاحب کے ایسے دلچسپ فقروں کا جواب ہمیشہ ایک معصوم شوخی کے ساتھ

دیا کرتی تھی لیکن چونکہ اس وقت شاہ صاحب کے الفاظ میں اس
نے ایک خاص وزن محسوس کیا، دل کی گہرائیوں کی مخصوص التجا
ان میں چھپی ہوئی دیکھی، ایک ایسی گرمی ان کے اندر پائی جس کی
تاب وہ مشکل سے لاسکتی تھی، اس لئے اُس نے چاہا کہ وہاں سے
اُٹھ کر چلی جائے لیکن شاہ صاحب نے اسے روکا اور بولے کہ
"کیا آج چا، تم نہ پلاؤ گی، کیا اپنے ہاتھ سے اُسے دو آتشہ
نہ بناؤ گی"؟

صفیہ جو بہت چھوٹی عمر سے شاہ صاحب کی ہر بات ماننے
کی عادی بنائی گئی تھی، باوجود حیا کے تقاضوں کے، وہاں سے
سے قدم نہ اُٹھا سکی اور چاروناچار اُسے ٹھہرنا ہی پڑا جب تک
کہ وہ چا، بنا کر پیش کرتی شاہ صاحب کے اوباشانہ فقرے (جن
کے درمیان وہ ایک آدھ لفظ اصطلاحات تصوف کے بھی اس
لئے صرف فرمادیتے تھے کہ اگر کبھی ضرورت ہو تو ان کی کوئی درویشانہ
تاویل بھی ہو سکے) برابر اسی طرح جاری رہے اور صفیہ کا سوءظن
بڑھتا رہا، یہاں تک کہ جب وہ وہاں سے نکلی تو اس کی تیوریاں
چڑھی ہوئی تھیں اور شاہ صاحب کے آخری مرتبہ روکنے کے
بعد بھی وہ یہ کہہ کر کہ "مجھے نیند لگی ہے"۔ وہاں سے چل دی۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

صفیہ کا نکاح ہو چکا ہے، جہیز کا سامان بکسوں میں بند کیا جا رہا ہے، رخصت کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور صفیہ ایک کمرہ کی خلوت میں دلھن بنی ہوئی جگمگا رہی ہے، محلہ کی عورتیں، پڑوس کی سہیلیاں، عزیزوں کی لڑکیاں صفیہ کے پاس آجا رہی ہیں کہ دفعۃً چودھری صاحب مکان میں داخل ہوتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ دلھن کا کمرہ خالی کر دیا جائے شاہ صاحب آرہے ہیں پڑھ کر دم کریں گے اور تعویذ باندھیں گے، یہ سنتے ہی ساری لڑکیاں تیتریوں کی طرح ادھر اُدھر غائب ہو گئیں اور تھوڑی دیر میں شاہ صاحب اندر تشریف لائے اور آہستہ آہستہ کمرے کی آرائش و زیبائش اور خلوت گاہ عروس کی اس عطریت کا لطف لیتے ہوئے جس میں دلھن کے جسم و ملبوس کی خوشبو کا حصّہ زیادہ غالب ہوتا ہے آگے بڑھے اور صفیہ کے سامنے بیٹھ کر بولے۔ "گھونگھٹ اٹھاؤ صبح قیامت دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں"۔

صفیہ جو شاہ صاحب کی طرف سے اپنے اندر اب نفرت سی محسوس کرنے لگی تھی یہ فقرہ سُن کر دل ہی دل میں برہم ہوئی اور

اُن کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی لیکن شاہ صاحب نے اس کو
ادائے معشوقانہ سمجھ کر اور زیادہ لطف لیا اور آخر کار ہاتھ بڑھا کر
گھونگھٹ اُلٹ دیا۔
ریشم سے بالوں کی کھجوری چوٹی اور اُس میں زربفت کا موباف
—— آڑی مانگ اور اُس میں سچے مقیش کے ذرّوں کی افشاں ——
بالوں کی ایک چھوٹی خمدار لٹ کا گوری پیشانی پر پسینہ کی وجہ سے
بھیگ کر چپک جانا —— نکھرے ہوئے کندنی رنگ میں خمدار
ابروؤں کی نمایاں سیاہی، بڑی بڑی آنکھوں کا لانبی نوک دار
پلکوں کے ساتھ مائل بزمین ہونا —— نازک ہونٹوں پر پان کی
سُرخی کا خشک ہو کر ذرا سیاہی مائل نظر آنا —— حنائی اُنگلیوں
میں جڑاؤ انگوٹھیوں کی زیبائش —— گلے میں پڑے ہوئے
طلائی ہار کا سینے پر جگمگانا —— ہاتھ میں طلائی چوڑیوں کا اپنے
جال کے اندر سے جسم کے رنگ کو نمایاں کرنا —— قمیض کے
تنگ کفوں کا کلائی میں چُبھ کر خون صحیح کے اجتماع سے جا بجا
گلابی دھبے پیدا کر دینا۔ یہ تھا وہ منظر جو گھونگھٹ اُلٹنے کے بعد
شاہ صاحب کو نظر آیا اور جس کو دیکھنے کے بعد ہی وہ حد درجہ
بیتاب ہو کر (شاید پھونک ڈالنے کی غرض سے!) آگے بڑھے

لیکن صفیہ نے جو اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اس درویش کے دل و دماغ
میں شیطان حلول کر گیا ہے اور جو یقین کرتی تھی کہ اب اس طرح
بے حجاب اُس کے سامنے ہونا اپنے شوہر کی طرف سے خیانت کا
مرتکب ہونا ہے دفعۃً اپنا ہاتھ اُٹھایا اور زور سے شاہ صاحب کو
ڈھکیل کر کھڑی ہو گئی، لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی یا وہاں سے
روانہ ہوتی، شاہ صاحب نے موقع کی اہمیت کو سمجھ کر ایک قہقہہ
لگایا اور یہ کہہ کر کہ "اچھا جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں"
وہاں سے چل دئیے۔

رات کو جس وقت نوشہ دُلھن کو رخصت کرا کے اسٹیشن پر
لایا اور گاڑی روانہ ہونے لگی تو ایک اجنبی آیا اور نوشہ کے ہاتھ
میں ایک لفافہ دے کر چلا گیا۔

ریاض احمد، دہلی کے ایک مشہور و معزز خاندان کا فرد تھا،
اور اپنے خصائل و عادات کے لحاظ سے حد درجہ دلکش انسان تھا
اسکے باپ دہلی کے مشہور وکیل تھے، لیکن انھوں نے اپنے بعد کوئی
جائداد نہ چھوڑی، ریاض نے بی۔ اے کرنے کے بعد پہلے تو تجارت
کی طرف توجہ کی لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو ملازمت کی

کوشش کی اور اعزاز خاندانی کی وجہ سے گورنمنٹ سکریٹریٹ میں دوسو روپیہ کی جگہ اس کو مل گئی، چودھری حاتم الزماں کے خاندان سے پہلے کی بھی قرابت تھی اس لئے صفیہ کے ساتھ اس کا نکاح دونوں خاندانوں کے لئے باعث مسرت تھا، ریاض بھی واقف تھا کہ صفیہ بہت پاکیزہ خصائل وشائستہ اطوار لڑکی ہے اور صفیہ بھی آگاہ تھی کہ ریاض کس درجہ پسندیدہ عادت کا انسان ہے، اس لئے قبل اس تعلق کے دونوں میں غائبانہ رشتۂ محبت قائم ہو چکا تھا اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ مسرور نظر آتا تھا۔

ریاض اس سے قبل بھی خورجہ آکر کئی مرتبہ چودھری صاحب کے ہاں مہمان ہوا تھا لیکن کبھی اُس نے شاہ صاحب کو نہ دیکھا تھا، اس مرتبہ جو آیا تو شاہ صاحب کو بھی دیکھا اور اس کو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ گھر میں کسی سے اس کا پردہ نہیں ہے۔ جب کبھی وہ خیال کرتا تھا کہ صفیہ بھی اس کے سامنے آتی جاتی ہوگی تو اسے غصہ بھی آجاتا تھا، چودھری صاحب نے جب شاہ صاحب کا تعارف ریاض سے کرایا اور گفتگو ہوئی تو اس کو شاہ صاحب کی ساری حقیقت معلوم ہوگئی اور اسی وقت سے ایک خاص فکر اس کو لاحق ہوگئی لیکن چونکہ ریاض کبھی اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہتا تھا اسلئے اس نے

بالکل خاموشی اختیار کرلی اور آئندہ واقعات پر فیصلہ چھوڑ کر دم بخود ہوگیا۔

ممکن تھا کہ دہلی پہونچکر صفیہ سے ملنے کے بعد وہ اس افسردگی و آزردگی کو دور کردیتا، لیکن اس خط نے جو اسٹیشن پر اسے دیا گیا تھا اُسکو سخت مضطرب کردیا وہ سمجھتا تھا کہ یہ خط چودھری صاحب کے کسی دشمن کا ہے جس نے مجھے مسرور شاہ کے حالات لکھ کر بھیجے ہیں، لیکن چونکہ وہ مسرور شاہ کی گھر میں بے تکلفانہ آمد و رفت کو خود دیکھ چکا تھا، اسلئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ خط کے مضمون کو غلط قرار دیتا۔

خط میں تو خیر بڑی داستان درج تھی لیکن جو فقرے اُس کے دل میں تیر و نشتر کا کام کر رہے تھے وہ یہ تھے کہ :۔

"مسرور شاہ کی محبوبہ سے تعلقِ ازدواج خدا کرے آپ کو مبارک ہو"۔

وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اپنے دماغ سے اس خیال کو جدا کردے لیکن جب اُس کے سامنے یہ منظر پیش آجاتا تھا کہ مسرور شاہ جوان ہیں، صورت دار ہیں، شکل و گفتگو میں خاص کشش رکھتے ہیں گھر میں بلا تکلف آتے جاتے ہیں تو اُسے یقین کرلینا پڑتا تھا کہ لکھنے والے کا یہ فقرہ غلط نہیں ہوسکتا۔

اُس کے احباب نے اُس کے چہرہ پر حزن و ملال کے آثار دیکھ کر دریافت بھی کیا کہ کیا بات ہے اور یہ خط کس کا ہے لیکن اس نے

مصنوعی ہنسی سے ٹال دیا اور کہہ دیا کہ میرے ایک دوست کا خط ہے جن سے میں چلتے وقت نہ مل سکا، بیمار ہیں اور اپنی بیماری کی وجہ سے عدم شرکت کا عذر کیا ہے

دہلی آئے ہوئے صفیہ کو ایک ہفتہ گزر چکا اور ریاض کا اضمحلال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، وہ اس کو محسوس کرتی ہے لیکن شرم کی وجہ سے سبب دریافت نہیں کر سکتی، کبھی دبی زبان سے یہ ضرور پوچھا کہ "کیسا مزاج ہے"؟ لیکن یہ خشک جواب ملنے پر کہ "الحمد للہ اچھا ہوں" خاموش ہو گئی۔ شادی سے قبل صفیہ نے اپنی جنت ارضی کی جو تصویر اپنے خیال سے کھینچی تھی وہ اب اسے وہم و گمان نظر آ رہی تھی، اور پریشان تھی کہ کیونکر ریاض کے اس غیر معمولی حزن و ملال کو دور کرے جس نے سارے گھر کو افسردہ بنا دیا تھا، اس نے ایک دن ہمت کر کے ریاض کو خط لکھا:۔

"میں نے آپ کو غیر معمولی افسردہ پا کر ہمیشہ کوشش کی کہ صحیح سبب دریافت کروں، لیکن میری ہمت قاصر رہی اور زیادہ سے زیادہ صرف خیریت مزاج پوچھ سکی، جس کا آپ نے بھی رسمی جواب دیدیا لیکن جب میں سوچتی ہوں کہ آخر یہ صورت کب تک قائم رہے گی اور تمام اسباب پر غور کرتی ہوں تو سخت پریشان ہو جاتی

ہوں، آپ کا غیر معمولی سکوت میرے نشاط زندگی کے لئے حقیقتاً ایک سنگین مہر ہے جس کو میں توڑنا چاہتی ہوں لیکن اپنے دست و بازو کو بہت ضعیف محسوس کرتی ہوں، خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور اگر کوئی سبب میری ذات سے متعلق ہے تو مجھے بتائیے کہ میں اپنے طرز عمل میں ویسی ہی تبدیلی پیدا کر لوں مجھ کو اپنے آپ سے اب شرم آتی ہے، کہ میری وجہ سے آپ ملول ہیں اور یقیناً مجھ کو مر جانا چاہیئے، اگر میری ذات آپ کی مسرّتوں کے راستے میں حائل ہو

میں نے اپنے مستقبل کے متعلق جو خیال قائم کیا تھا وہ بالکل موجودہ حال کے مخالف تھا، میں اس کو اپنے تصور میں بہت رنگین و شگفتہ پاتی تھی اور یقین کرتی تھی کہ میری آئندہ زندگی یکسر قہقہۂ مسرت ہوگی، لیکن میں نتیجہ کو حد درجہ دردناک پاتی ہوں اور اپنی جان سے بیزار

اگر اس کا سبب میری ذات کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق ہے تو بھی میں اس کو سنوں اور اگر اسے دور نہیں کر سکتی، تو کم از کم آپکے ساتھ اسی خیال کے ماتحت ملول رہوں"۔

بدنصیب، صفیہ

ریاض واقعی سخت افسردہ و مضمحل تھا اور اس کی حساس طبیعت روزانہ اس کو زیادہ دل گرفتہ بناتی چلی جا رہی تھی وہ جس قدر غور کرتا تھا اس گمنام خط کی تحریر صحیح معلوم ہوتی تھی اسی خیال سے وہ دق کی سی گرمی اپنے جسم کے اندر پیدا ہوتے ہوئے پاتا تھا، اُس نے بارہا ارادہ کیا کہ صفیہ سے مسرور شاہ کا ذکر چھیڑ کر حقیقت کا علم حاصل کرے لیکن چونکہ وہ فطرتاً بے انتہا ضابط واقع ہوا تھا اس لئے اُس میں کامیاب نہ ہو سکا، اور بدستور سکوت و خاموشی کے ساتھ کڑھتا رہا، گُھلتا رہا۔ جس وقت صفیہ کی تحریر اسے ملی، اور بھی زیادہ دلگیر تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ اپنی ملازمت پر جا کر بقیہ ایام کی رخصت منسوخ کرا دے اس تحریر کو اُس نے بار بار پڑھا اور اس میں ہر بار ایسی صداقت پائی کہ بارِ غم کچھ ہلکا ہونے لگا اور آہستہ آہستہ شام تک وہ اسقدر شگفتہ ہو گیا کہ آخر کار صفیہ کے پاس جا کر وہ اس معاملہ میں گفتگو کرنے پر مجبور ہو ہی گیا۔

صفیہ مغموم و افسردہ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی اور کبھی کبھی سامنے فانوس کے گرد اُن پتنگوں کے ہجوم کو بھی دیکھ

لیتی تھی جو بیتابانہ طواف کر رہے تھے، ریاض کی آہٹ سُن کر وہ چونکی اور سنبھل کر بیٹھ گئی، ریاض آکر سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک خاص انداز تبسم کے ساتھ بولا:۔

"میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تمہارے خط نے بڑی حد تک میرے غم کو دور کر دیا، مجھے افسوس و ندامت ہے کہ کیوں اس وقت تک میں نے اپنے طرز عمل سے تمہیں تکلیف پہونچائی لیکن اپنی طبیعت سے مجبور ہوں کہ ذراسی بات بھی دل پر تیر کا سا کام کرتی ہے اور جو خیال قائم ہو جاتا ہے مشکل سے نکلتا ہے حقیقت یہ ہے کہ میری افسردگی کا سبب تمہیں سے متعلق تھا، اور اس وقت مجھے صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ مجھے تمہارے اور مسرور شاہ کے تعلق کی نسبت جو خبر معلوم ہوئی تھی اُس نے مجھے ملول بنا رکھا تھا، لیکن تمہاری تحریر میں ایسا جذبۂ محبت پنہاں تھا کہ اُس نے خود بخود میرے اس وہم کو دور کر دیا اور میں اب تمہارے منھ سے بھی یہ سننے کے لئے آیا ہوں کہ تم مسرور شاہ کے سامنے نہ آتی تھیں اور تم سے اس سے کبھی گفتگو نہیں ہوئی"۔

صفیہ گفتگو شروع ہوتے ہی سمجھ گئی تھی کہ کیا قصہ ہے اور اس نے

ساری صورت حال اور اپنے شوہر کی طبیعت پر غور کر کے فیصلہ کر لیا تھا
کہ اس کو کیا جواب دینا چاہیئے، اس کو اپنی عفت کا یقین تھا لیکن وہ
سمجھتی تھی کہ اگر ریاض کو معلوم ہو گیا کہ مسرور شاہ سے وہ بے تکلفانہ
ملتی تھی تو کبھی اس کو اس کی عصمت کا یقین نہ آئے گا اور نتیجہ بہت
خراب پیدا ہو گا، اس لیئے اُس نے دروغ مصلحت آمیز پر عمل کرنا
مناسب سمجھا اور ریاض کی گفتگو ختم ہوتے ہی اُس نے کہا کہ:۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ پر میری تحریر نے اچھا اثر کیا اور آپ نے
مجھ سے دریافت کر لینا مناسب سمجھا، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں
کہ جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے، اس میں شک
نہیں کہ میرا سارا گھر مسرور شاہ کا مرید ہے اور میں بھی اُنکی
مرید ہوں لیکن آپ باور کیجیئے کہ میں اُن کے سامنے کبھی نہیں
آئی اور نہ کبھی گفتگو کی نوبت آئی"۔

ریاض صفیہ کے اس جواب سے بالکل مطمئن ہو گیا اور اُس کا
رنج و ملال بالکل دور ہو گیا۔

— — — — — — — — —

— — — — — — — — —

شادی کو دو مہینے کا زمانہ گزر چکا ہے اور ریاض مع اپنی بیوی کے

شملے میں مقیم ہے۔ اس دوران میں دو مرتبہ صفیہ خود جہ گئی اور آئی۔
ریاض ایک ایک ہفتہ اپنی سسرال میں رہے اور صفیہ کو ہنسی خوشی
ساتھ لائے، دونوں کی زندگی نہایت لطف و مسرت کے ساتھ بسر
ہو رہی ہے، محبت و خلوص میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس
وقت تک پھر کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جو ادنیٰ سا اختلاف
بھی اُن کے درمیان پیدا کرتی۔

ایک دن صبح کو ریاض باہر مردانخانہ میں بیٹھا تھا کہ ڈاکئے
نے دو خط لا کر دئے، دونوں لفافے تھے اور چودھری صاحب کے
ہاتھ کا پتہ لکھا ہوا تھا، ایک اُس کے نام کا تھا اور دوسرا صفیہ کے
نام کا، صفیہ کا خط تو اُس نے اسی وقت خادمہ کے ہات اندر بھیجدیا
اور اپنے نام کا کھول لیا۔ لیکن کھولنے کے بعد تحریر کو دیکھ کر معلوم
ہوا کہ خط کا مضمون صفیہ کے لئے ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ لفافہ بند کرتے
وقت غلطی ہوگئی ہے اور میرے نام کے لفافہ میں صفیہ کا خط بند
ہوگیا ہے اس نے چاہا کہ اس خط کو اندر بھجوا کر پہلا خط منگوا لے کیونکہ
اسے یقین تھا کہ اس میں میرے نام کا خط ہوگا، لیکن اس لفافہ میں
ایک اور بند لفافہ بھی صفیہ کے نام کا ملا جس پر پتہ کسی غیر ہاتھ کا
لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا، پہلے تو اس کو کھولنے میں تامل ہوا لیکن پھر خدا

معلوم کس خیال سے اُس کو کھول لیا، اور شروع سے آخر تک پڑھا، لیکن حالت یہ تھی کہ چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا اور ایک ایسا کرب اس کی حرکات سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے جان نکلتے وقت طاری ہوتا ہے۔

اس خط کا مضمون یہ تھا:۔

"پیاری صفیہ،

تمھاری شادی کے بعد میں بھی وطن چلا آیا اور پھر خورجہ نہیں آیا، اس خیال سے کہ اب وہاں کون ہے جس کو دیکھ کر جی لگے گا۔

چودھری صاحب نے جب بہت اصرار کیا تو اب آیا ہوں اور یہ خط تمھیں لکھ رہا ہوں، شادی کے بعد میں نے تمھیں نہیں دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ تم میں اب کیا تغیّر ہو گیا ہو گا، لیکن اب میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا، واقعہ تو یہ ہے کہ دیکھ ہی نہیں سکتا

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف

افسوس وہ دلربا ادائیں

تم نے شادی سے ایک شب قبل جو پان مجھ کو دیا تھا، وہ میرے پاس اب تک موجود ہے اور شاید ہمیشہ محفوظ رہے کبھی کبھی جب جی گھبراتا ہے تو اس کو دیکھ کر تسکین دے لیتا ہوں کہ اس کو تمھارے ہاتھوں نے چھوا ہے، میں آجکل خورجہ

میں ہوں اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تم بھی ہفتہ عشرہ کیلئے
آجاتیں، یہ ناممکن ہو تو اطلاع دو میں شملہ آسکتا ہوں یا نہیں"۔
خط کے نیچے کاتب کا نام درج نہ تھا، لیکن ریاض فوراً سمجھ گیا کہ
مسرور شاہ کی تحریر ہے اور اس کے غم وغصہ کی انتہا نہ رہی جب
اُس نے محسوس کیا کہ صفیہ اس سے جھوٹ بولی ہے اور یقیناً یہ جھوٹ
اسی لئے بولا گیا تھا کہ اس تعلق کو چھپایا جائے
اس کا چہرہ سُرخ تھا، آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور کبھی
کبھی وہ نہایت سخت ارادہ دل میں قائم کرتا تھا، کامل ایک گھنٹہ
تک کمرے میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح ٹہلتا رہا اور پھر باہر ہی
باہر دفتر چلا گیا، دفتر میں اُس نے کچھ کام نہیں کیا اور برابر اسی امر پر
غور کرتا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے، آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا، اور وہیں
سے صفیہ کو اطلاع دی کہ خورجہ چلنے کے لئے تیار ہو جائیں، چودھری
صاحب کی سخت علالت کا تار آیا ہے، اُس نے چودھری صاحب کو
بھی تار دیدیا کہ فلاں گاڑی سے خورجہ آرہا ہوں لیکن اُتروں گا نہیں
دوسری جگہ ضروری کام سے جانا ہے، صفیہ کو لینے کے لئے کسی کو
اسٹیشن بھیجدیا جائے۔ شام کو جب ریاض گھر آیا تو غصہ سے اُسکا
بُرا حال تھا...... صفیہ بھی اس خبر سے بہت ملول تھی...... کہ

چودھری صاحب سخت علیل ہوگئے ہیں اس لئے اس نے ریاض کے اضمحلال کو بھی اسی پر محمول کیا اور اسی خاموشی کے عالم میں شملہ سے خورجہ تک کا سفر طے ہوگیا۔ جب صفیہ خورجہ کے اسٹیشن پر پہونچی اور اُسے معلوم ہوا کہ ریاض نہیں اُترے گا، کیونکہ اُسے کہیں باہر جانا ہے تو وہ کھٹک گئی لیکن وہاں کیا کہہ سُن سکتی تھی۔ اُس نے بہت کچھ کوشش کی کہ پالکی میں سوار ہوتے وقت ریاض سے مل لے لیکن اُس نے آنے سے انکار کر دیا، اور صرف یہ کہلا بھیجا کہ "خدا حافظ"۔

صفیہ کو خورجہ آئے ایک مہینہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں یہ حقیقت سب پر روشن ہوگئی ہے کہ ریاض ناخوش ہو کر صفیہ کو چودھری صاحب کی علالت کے بہانہ سے یہاں پہنچا گیا ہے لیکن برہمی کا سبب کسی کو معلوم نہ ہوسکا، صفیہ نے متعدد خطوط ریاض کو لکھے لیکن کسی کا جواب نہ آیا، بدیع الزماں کو بھیجا گیا، لیکن اس سے بھی ریاض نے کوئی سبب نہیں بتایا اور صرف یہ کہلا بھیجا کہ میں صفیہ کو اپنے پاس رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ اپنے گھر میں رہیں، میرے امکان میں جو خدمت ہے مجھ سے کرتا رہوں گا لیکن اگر اس پر

بھی وہ مطمئن نہ ہوں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ ہمیشہ کیلئے اُن کو آزاد کر دوں اور وہ مجھ سے زیادہ اہل انسان سے رشتہ ازدواج قائم کر لیں۔

چودھری صاحب اور اُن کے خاندان کو اس واقعہ سے جو صدمہ ہونا چاہیئے ظاہر ہے، لیکن صفیہ کی حالت جیسی خراب ہو گئی وہ نا قابل بیان ہے، غذا ترک ہو گئی، سونا حرام ہو گیا اور فرط الم سے حرارت قائم ہو گئی، رات دن ایک بند کمرے میں منھ لپیٹے رویا کرتی تھی اور موت کی دعائیں مانگا کرتی تھی، چودھری صاحب کا ایک مرتبہ ارادہ ہوا کہ ریاض سے طلاق حاصل کر لی جائے لیکن جب صفیہ سے اس کا ذکر آیا تو اس نے سخت مخالفت کی، اور پھر یہ خیال ترک کر دیا گیا۔

صفیہ کی علالت کو چھ ماہ ہو گئے ہیں اور متفقہ طور پر طبیبوں اور ڈاکٹروں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ دق میں مبتلا ہے، علاج ہو رہا ہے لیکن ناکام کیونکہ اوّل تو صفیہ دوا پیتی نہیں اور پیتی بھی تو کیا جب کہ غم ہر وقت شمع کی طرح اُسے گھلائے دے رہا تھا، زمانہ گزرتا گیا، صفیہ کی حالت بدتر ہوتی گئی، ریاض کو بارہا بلانے کی

کوشش کی لیکن بے سود۔

چونکہ صفیہ کو اپنے مرجانے کا یقین تھا، اس لئے وہ اس خیال سے تو خوش تھی، لیکن یہ کانٹا اس کے دل میں برابر کھٹک رہا تھا، کہ ریاض کی برہمی کا سبب اس کو معلوم نہ ہوسکا۔ ایک دن جب اُس نے دیکھا کہ اس کا نظام تنفس خراب ہوگیا ہے تو اُس نے ریاض کو آخری خط اور لکھا، جس میں داستانِ دل بہت دردناک طریقہ سے دہرائی اور آخر میں یہ بھی لکھا کہ:۔

"میں اب مر رہی ہوں اور غالباً اب اگر آپ آئیں بھی تو مجھے زندہ نہ پائیں گے، اس لئے بغیر اس کے برہمی کا سبب معلوم کروں، آپ سے اپنی خطاؤں کی معافی چاہتی ہوں، خدا کرے اب بھی آپ کو رحم آجائے اور میری اس التجا کو سُن لیں، کیونکہ مرنے کے بعد اگر واقعی زندگی ہے تو وہ اسی طرح مسرور گزر سکتی ہے کہ مجھے یہاں نہ سہی عالمِ ارواح ہی میں اس بات کا علم ہو جائے کہ آپ میری خطاؤں سے درگزر کر چکے ہیں"۔

اس خط کے بھیجنے کے بعد صفیہ کی حالت پھر سنبھلی اور

آثار صحت نمودار ہو چلے، جیسا کہ مرنے سے چند روز قبل بعض آدمیوں میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ساتویں دن جب کہ صفیہ صبح کو ہاتھ منہ دھو کر پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی، ڈاک سے ریاض کا خط آیا، صفیہ نے جس طرح اضطراب کے ساتھ اُسے کھولا ہو گا ظاہر ہے، لیکن کس قدر حسرت ناک منظر تھا کہ خط پڑھتے ہی اس پر نہایت سخت دورہ اختلاج کا پڑا اور فوراً قلب کی حرکت بند ہو جانے سے وہ ہمیشہ کے لئے دنیا کے غموں سے فارغ ہو گئی۔

ریاض نے لکھا تھا:۔

"میری برہمی کا سبب تو دوسرے خط سے معلوم ہو گا جسے میں ملفوف کرتا ہوں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے میں نہایت سچائی اور صداقت کے ساتھ آپ کی خطاؤں کو معاف کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ خدا کرے آپ کی آئندہ زندگی (خواہ وہ اس دنیا کی ہو، یا کسی دوسرے عالم کی) مسرور بسر ہو"۔

دوسرا ملفوف خط وہ تھا جو مسرور شاہ نے صفیہ کو لکھا تھا

ہرچند چودھری صاحب نے اس واقعہ کو چھپانے کی بہت کوشش کی، لیکن سارے قصبہ کو رفتہ رفتہ حقیقت کا علم ہوگیا اور چودھری صاحب کو فرط غیرت سے اپنی ساری جائداد فروخت کر کے جلاوطن ہو جانا پڑا۔

مولوی حکیم......اور ہم!

(۳)

وسط ہند اور صوبہ متوسط کا شائد ہی کوئی لکھا پڑھا شخص ایسا ہو جو مولوی حکیم .... صاحب ناظم یتیم خانہ .... شریف سے واقف نہ ہو

اپنے اعضا کی مضبوطی، قامت کی تنومندی اور پھیل جانے والے گوشت کے لحاظ سے یہ اس ساخت کے انسانوں میں سے ہیں جن کے جسم کی لمبائی کو ہمیشہ اس کی چوڑائی سے شکایت رہتی ہے۔ ہر چند جسم کی یہ چوکور تعمیر یہ مربع ترکیب عام طور پر صرف اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے جو صرف ایک جگہ بیٹھ کر رات دن بیکاری کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ باوجودیکہ ناظم صاحب رات دن فراہمی چندہ کی فکر میں

سرگشتہ و حیران پھرتے رہتے ہیں اور غریب یتیموں کا گہرا درد
دل میں رکھتے ہیں، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قوم کے محتاج
بچّوں پر اس رات دن کڑھنے والے انسان کے جسم نے
اُس زمانہ میں بھی جب کہ طاعون کے خوف سے شہر کا ہر شخص
گھل کر کانٹا ہو جاتا ہے، ایک انچ کی کمی کو منظور کیا ہو
ہم نے ناظم صاحب کو متعدد بار موسمی خرابیوں کے
زمانہ میں بھی دیکھا، لیکن اُن کی یہ خصوصیت کبھی اُن سے
منفک نظر نہ آئی کہ :۔

جب وہ کوشش کر کے چلنے میں اپنے آپ کو ذرا تان
لیتے تو فربہ جسم کے پٹے باز (کھلونہ) ہو جاتے اور بیٹھتے وقت
جب وہ اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتے تو اُن کی حالت ہو بہو
ایسی ہو جاتی جیسے سلولائڈ کا وہ کھلونا جسے آپ کتنا ہی مار مار کر
لٹائیے لیکن وہ بے شرم ہمیشہ بیٹھا ہی رہتا ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں کا ایک مشہور شعر ہندی زبان کا ہے
جس میں وہ ایک مست و بے خبر لڑکی کے جوش شباب کا ذکر
اس طرح کرتے ہیں کہ :۔

"جب دیکھو وہ درزن کے گھر پر جھگڑا کرتی نظر آتی ہے

کہ میں روز اپنا محرم تجھے ڈھیلا کرنے کے لئے دیتی ہوں
اور تو روز اُسے تنگ کرتی جاتی ہے"۔

بالکل یہی حال ہمارے ناظم صاحب کے جوشِ فربہی کا بھی ہے کہ کبھی کوئی اچکن ان کے جسم پر ٹھیک نہیں آتی اور پیٹ پر بھی جو جسم کا سب سے زیادہ نرم حصّہ ہے کپڑے کے تناؤ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ قوی سی قوی چٹکی بھی اس پر بغیر پھسلے ہوئے نہیں رہ سکتی

اسی سلسلہ میں غالباً بے محل نہ ہوگا اگر ان کے سراپا کی دو چار خصوصیات اور بھی ظاہر کر دی جائیں:۔

رنگ سیاہ، خط و خال بھدّے، ناک موٹی، ہونٹ نسبتاً ذرا پتلے، دانت برابر لیکن پان کی سُرخی اُن پر قائم، بھویں چوڑی اور آنکھیں شوخ و شریر، پاجامہ شرعی، جوتہ ہندوستانی، جاڑوں میں سر پر صافہ باندھتے ہیں اور گرمیوں میں کپڑے کی گول ٹوپی جس پر ریشمی یا کلابتونی کام ہوتا ہے۔ ایک رومال میں یتیم خانہ کی روداد، رسید بُک اور اسی طرح کے چند کاغذات لپٹے ہوئے بغل میں۔ یہ ہے ہمارے ناظم صاحب کا سراپا مع اُن تمام اضافیات کے جن سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک سپاہی جنگ کے وقت اپنے آلات حرب سے۔

میری اُن کی شناسائی اوّل اوّل اُس وقت ہوئی
جب وہ ریاست .... میں (جس کو وہ اپنی بہترین چراگاہ
سمجھتے ہیں) چندہ کی فراہمی یا ابلہ فریبی کے لئے تشریف فرما ہوئے
تھے۔ مجھ میں یہ سخت عیب (یا خوبی) یہ ہے کہ اوّلین نگاہ میں
ایک انسان کے تمام نفسیاتی کیفیات اور اخلاقی حالات مجھ پر
روشن ہو جاتے ہیں اور بہت کم پہلی دفعہ کی قائم کی ہوئی رائے
مجھے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے

صبح کا وقت تھا، سردی ہلکی ہو کر بہت خوشگوار ہو گئی تھی اور
میں ایک ایسے دوست کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا جہاں میرا جانا صرف
تفریح کی بنا پر ہوا کرتا تھا، لطف و مزاح کی پوری کیفیت مجھ پر
طاری تھی کہ بدقسمتی سے جناب ناظم صاحب کا مجسمہ حرکت کرتا ہوا
دروازہ کے اندر داخل ہوا اور قبل اس کے کہ میں اُن کے مطالعہ
سے فارغ ہوتا ایک ایسی شان کے ساتھ جس میں انسانیت کم اور
فضل و کمال کی نمائش سے زیادہ کام لیا گیا تھا، نہایت بلند آہنگی
سے "السلام علیکم" کہتے ہوئے قریب آ ہی گئے چونکہ وہ میرے
مکان پر مجھ سے ملنے کے لئے نہ آئے تھے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی
کہ میں اُٹھ کر خیر مقدم ادا کرتا لیکن میرے دوست نے جو حقیقت سے بہت

زیادہ اپنے اخلاق کی نمائش میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں، سروقد تعظیم دی، ہاتھ ملایا، قریب کی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی اور اپنا مسکراتا ہوا لیکن خاموش چہرہ ان کی طرف بڑھا دیا، گویا وہ یہ سوال کر رہے تھے کہ "جناب نے کیوں زحمت فرمائی"۔

ناظم صاحب ایسے پیشہ ور چندہ وصول کرنے والے کو جس انداز سے اپنا تعارف کرانا چاہیے تھا، اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ تھی، یتیم خانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا بیان، وہاں کا حسن اہتمام، قرآن و احادیث کے حوالہ سے یتامیٰ کی خدمت کا اجر اور پھر اپنے خدمات جلیلہ اور ایثار و قربانی کا بیان، نقشوں اور کاغذات کے ذریعہ سے آمد و خرچ کا حساب، یتیم خانہ کی کامیابی کی روداد، بڑے بڑے لوگوں کی امداد کا ذکر، الغرض انھوں نے ایک نہایت ہی مربوط و مسلسل بیان کے ذریعہ سے (جو برسوں کی مشق کی وجہ سے بہت صفائی کے ساتھ ادا ہوتا تھا) میرے دوست کو متاثر کرنیکی پوری کوشش کی اور آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ میں یہاں صرف آپ ہی کی ہمدردی، اخوت، اور اسلام دوستی پر اعتماد کر کے آیا ہوں جس کے اعتراف میں سوائے اس کے میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ"۔

ان کی فطرت کے مطالعہ کرنے میں جو کمی رہ گئی تھی وہ اس تقریر کے دوران میں پوری ہوگئی اور جب وہ اس طرف سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوئے تو میں اُن کے حملہ کی مدافعت کے لئے پوری طور پر آمادہ وطیار تھا۔

انھوں نے رسید کی کتاب نکال کر میری طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا کہ :۔

"جناب کی طرف سے کس قدر عطیہ تحریر کردوں"۔

میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "دو ہزار"

انھوں نے خفیف تبسّم کے ساتھ پہلے میرے دوست کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے :۔

"تو پھر آپ اپنے ہی قلم سے لکھ دیجئے"

میں نے کہا "لائیے"

اور میز سے قلم اُٹھا کر میں نے رسید بک کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ غالباً اس سے زیادہ اپنی ایکٹنگ کو قائم نہ رکھ سکتے تھے اور ایسا شخص جب ایکٹنگ سے جدا ہو کر کسی حملہ کی مدافعت کرتا ہے تو ہمیشہ برہمی کے ساتھ، اس لئے انھوں نے رسید بک کو پھر اپنی جیب میں رکھ لیا اور بولے :۔

"اگر آپ کو امداد کی توفیق نہیں ہے تو مذاق بھی نہ کیجئے"

میں نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ :-

"مذاق کا موقع ابھی تو پیدا ہی نہیں ہوا، آپ نے خود ہی میری طرف سے عطیہ تحریر کرنا چاہا اور جب میں نے اس کی مقدار دو ہزار متعین کی تو آپ ہی نے اس سے احتراز کیا۔ اگر میں اس کو منظور نہ کرتا کہ میری جانب سے اسقدر عطیہ تحریر کیا جائے تو بیشک مذاق تھا، جناب ناظم صاحب میں آپ کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے نام کے ساتھ اس قدر عطیہ کی نسبت نہایت خوشی سے گوارا کر لوں گا اور کبھی کسی سے ذکر نہ کروں گا کہ اس سے مقصود صرف فہرست میں ایک فرضی اضافہ کرنا مقصود تھا۔"

میں ان کا چہرہ دیکھ کر پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ مغلوب الغضب آدمی ہیں، لیکن اب عملی ثبوت بھی مل گیا، اُن کے سیاہ رنگ میں چہرہ کی سُرخی تو زیادہ نمایاں نہ ہو سکی، لیکن ان کی آنکھوں کا مکر ظاہر ہو گیا اور ایک ایسے غصہ کے ساتھ جس میں انسان اپنے خبث باطن کو نہیں چھپا سکتا اور جس کا ظہور اکثر و بیشتر اس نوع کے وعظ پیشہ اور مولوی منش لوگوں کی طرف سے ہوا کرتا ہے، کف آلود لبوں کے ساتھ تن کر بولے :-

"اسلام کو تمہیں ایسے لوگوں نے تباہ کیا ہے اور تمہیں ایسوں کے لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ازلی اندھے، گونگے اور بہرے ہیں۔ تمہارے دل سیاہ ہیں، پتھر سے زیادہ سخت ہیں اور تم کبھی کسی سے اچھے کام کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ، میں تو صورت دیکھ کر سمجھا تھا آپ کوئی بھلے آدمی ہوں گے، لیکن یہ کیا خبر تھی کہ آپ کے اندر ابلیس حلول کر گیا ہے"۔

جب مجھے کسی ایسے آدمی سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے تو میں پورا لطف اُٹھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں اور ہلکی سی ہلکی کیفیت بھی برہمی کی اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیتا، میں نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ:۔

"مولانا آپ بزرگ ہیں ہمارے مرشد و رہنما ہیں، جو چاہے ارشاد فرمائیے اور جس قدر جی میں آئے بُرا کہہ لیجئے، مجھے کبھی ناگوار نہ ہوگا، لیکن تھوڑا سا افسوس ہے تو صرف یہ کہ میں آپ کی گالیوں کو سُن کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ:۔

"جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا"

اور ہاں قبلہ یہ تو فرمائیے کہ ابلیس کیسے حلول کرتا ہے۔ ایک زمانہ کے بعد ملاقات ہوئی ہے، آج تو بغیر دریافت کئے میں آپ کو

جانے نہ دوں گا"۔

ناظم صاحب قبلہ پھر بولے کہ :۔

"بس خاموش رہئے، میں مسخروں سے بات نہیں کرتا"۔

اور میرے دوست سے مخاطب ہو کر فرمایا :۔

"میرے لئے کیا حکم ہوتا ہے"؟

اُنھوں نے کہا کہ "میں ہر وقت آپ کی امداد اور ایسی قومی تحریکوں کی خدمت کیلئے تیار ہوں، لیکن آپ کا بڑا احسان میرے اوپر ہوگا اگر آپ (میری طرف اشارہ کرکے) اس دہریہ کو کسی طرح قابو میں لائیں (میری طرف مخاطب ہو کر) کیوں جی تمھیں مطلق کوئی ہمدردی قوم کے یتیم بچّوں سے نہیں ہے اور ناظم صاحب کی گفتگو سے تم پر کوئی اثر نہیں ہوا"۔

میں نے کہا۔ "اثر کی آپ نے خوب کہی، میں روز شام کو بازار میں سانڈے کا تیل بیچنے والوں کی آوازیں سُنا کرتا ہوں اور خاموش گزر جاتا ہوں"

یہ سننا تھا کہ ناظم صاحب پھر بے قابو ہو گئے اور پوری آواز کے ساتھ چیخ کر بولے کہ :۔

"میں سانڈے کا تیل بیچنے والا ہوں کیا کہا، ذرا پھر تو کہنا"

میں نے جواب دیا کہ "بندہ نواز" برہم نہ ہو جیے میں نے آپ کو تو سانڈے کا تیل بیچنے والا نہیں کہا اور نہ آپ حقیقتاً ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو کیا حرج ہے، کیونکہ میرے نزدیک آپ سے زیادہ موزوں سانڈے کی تجارت کے لئے شاید ہی کوئی اور ہو سکتا ہے معاف فرمائیے میرا مدعا تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھ پر آپ کی سحر بیانی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس بات کو میں نے ایک تشبیہہ کے ذریعہ سے ظاہر کیا تاکہ آسانی سے سمجھ میں آسکے"

الغرض یہ تھی میری ان کی اولین تقریب ملاقات جو خدا جانے کس ساعت میں ہوئی تھی کہ اس کے بعد بھی جب مجھ سے وہ ملے ہمیشہ نوک جھونک ہی رہی اور کبھی میں نے ان کو سنجیدگی کے ساتھ خطاب کرنیکا اہل نہ سمجھا۔ ان کو اور دعووں کے ساتھ طبابت میں بھی کمال رکھنے کا دعویٰ تھا۔ لیکن مجھ پر اس کی بھی حقیقت جلد روشن ہو گئی، ان کا معمول تھا کہ جب کسی شخص سے ملتے تو سب سے پہلے متعلقین کی خیریت دریافت کرتے اور چونکہ بڑے خاندانوں میں کوئی نہ کوئی ہمیشہ علیل ہی رہتا ہے اسلئے جواب ان کی توقع کے موافق ملتا اور مرض دریافت کرنے کے بعد کبھی تو وہ فوراً کہہ اُٹھتے کہ اس کا علاج تو میں شرطیہ کرتا ہوں اور چند واقعات اپنی حذاقت کے بتا کر فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے اور کبھی مریض کی نبض

دیکھ کر (اگر زیادہ متاثر کرنا مقصود ہوتا) حکم لگا دیتے کہ مرض نہایت سخت ہے اور اگر احتیاط نہ کی گئی تو صحت حاصل ہونا محال ہے چونکہ ہندوستان کے مریضوں میں ۹۰ فیصدی سے زیادہ ایسے ہوتے ہیں جو فن طب سے نابلد ہوتے ہیں اس لئے ان کا یہ حربہ بہت جلد کارگر ہوجاتا اور وہ پھر چندہ کے ساتھ دواؤں کے لئے بھی کافی رقم وصول کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔ ایک دن شام کو میرے مکان پر تشریف لائے میں کچھ مضمحل سا تھا، صورت دیکھ کر بولے :۔

"آپ کے چہرہ پر خون بالکل نظر نہیں آتا، مجھے اندیشہ ہے کہیں تولید خون تو آپ کی بند نہیں ہوگئی، لائیے ذرا نبض تو دیکھوں"۔

میں نے کہا کہ "آپ کا خیال غلط ہے، مجھے تو خون کی زیادتی کی شکایت تھی چنانچہ آج ہی فصد کے ذریعے سے چار سیر خون میں نے نکلوایا ہے، اسی لئے شاید آپ کو چہرہ پھیکا معلوم ہوتا ہوگا، لیکن کل تک یہ حالت باقی نہ رہے گی، آپ بالکل مطمئن رہیں"

وہ یہ سُن کر مسکرائے اور بولے کہ "گھر میں تو سب خیریت ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ "آج کل فصل خراب ہے اور اسلئے قریب قریب سب بیمار تھے لیکن ابھی ابھی میں نے دس تولہ سنکھیا پیس کر کھلادی ہے صبح تک انشاء اللہ سب تندرست ہوجائیں گے"

الغرض انھوں نے بہت کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح کسی کی بیماری کی خبر انھیں ملجائے اور وہ اپنی خدمات پیش کر کے مجھے رام کر سکیں لیکن انھیں اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ جب چلنے لگے تو فرمایا کہ:۔

"آپ نے اپنا چندہ ابھی تک نہیں دیا، میں کل جا رہا ہوں مجھے بہت افسوس ہوگا اگر آپ کا نام یتیم خانہ کی فہرست معاونین میں شامل نہ ہوا"

میں نے جواب دیا کہ "میری بد قسمتی، لیکن کیا کروں یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میرے اوپر ...... کے یتیموں کی خدمت کیونکر فرض ہے جبکہ خود میرے گھر کے بہت سے افراد میری اعانت کے محتاج ہیں علاوہ اسکے مجھے بھی یہ یقین نہیں آتا کہ جو چندہ آپ وصول کرتے ہیں وہ حقیقتاً یتیموں کے کام آتا بھی ہے یا نہیں۔ آپ صرف روداد، اور انجمن کی کارروائی دکھا کر اپنی خلوص نیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کوئی چیز الہامی نہیں ہے اور روپیہ وصول کرنے کیلئے اس سے بھی زیادہ غیر معصوم لٹریچر دنیا میں تیار ہوتا رہتا ہے۔ بہرحال میں اس قسم کی امداد بالکل ناجائز سمجھتا ہوں۔ البتہ مقامی لوگ اگر کسی ایسی تحریک سے مطمئن ہوں تو وہ مدد کر سکتے ہیں، اور انھیں کرنی چاہیئے"

ناظم صاحب نے بہت کچھ سر مارا، لیکن اس باب میں چونکہ میں اکبر الہ آبادی کا معتقد ہوں اسلئے انھیں کامیابی نہ ہوئی جب وہ میری طرف سے مایوس ہو گئے

توپھر انھوں نے اسی کو غنیمت جانا کہ جب وہ کسی جلسہ میں لوگوں کو اپنے
مکر کا شکار بنا رہے ہوں تو کم از کم میں وہاں نہ ہوں، لیکن یہ بھی عجیب اتفاق تھا
کہ جب اور جہاں کہیں وہ پہونچے میں بھی ضرور پہونچ گیا اور نتیجہ یہی ہوا کہ اُنکی تمام
کارگاہ فریب درہم برہم ہوگئی۔ ایک روز، ریاست کے ایک نہایت ہردلعزیز اور
مشہور افسر کے مکان پر مجمع احباب تھا اور ناظم صاحب تقریر فرمارہے تھے کہ:۔

"گزشتہ سال جب ..... شریف میں طاعون ہوا تو چین کے ایک
بزرگ جنکی عمر ایک سو پچاس کی تھی زیارت مزار کے لئے تشریف لائے اور
قریب کے پہاڑ پر قیام کیا، جب وبا بہت زیادہ پھیلی اور لوگوں کی پریشانیاں حد سے
گزر گئیں تو وہ بزرگ پہاڑ سے اُتر کر یتیم خانہ میں آئے اور ایک تعویذ مجھے بھی دیا
کہ اس کو چھپوا کر تقسیم کر دو، لیکن سوا لاکھ سے زیادہ تقسیم نہ کرنا اور ایک آنہ سے
زیادہ نذرانہ نہ لینا۔ چنانچہ اسوقت تک تمام تعویذ ختم ہوگئے اور صرف چار ہزار
باقی ہیں جو میں یہاں لیتا آیا ہوں، یہ تعویذ اس قدر مجرب ثابت ہوا ہے کہ
طاعون میں مبتلا ہونے کے بعد بھی اگر یہ کسی کے گلے باندھ دیا گیا تو فوراً اچھا
ہوگیا اور ایسی تو ایک مثال بھی نہیں ہے کہ پہلے سے کسی نے باندھ لیا ہو اور
پھر وہ مبتلا ہوگیا ہو"۔

چونکہ اس زمانہ میں یہاں بھی یہ مرض پھیلا ہوا تھا۔ اسلئے قدرتاً ہر شخص کو اس
طرف توجہ ہوئی اور نذرانہ دیکر دو چار تعویذ ہر شخص نے لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

میں خاموش تھا اور غالباً خاموش رہتا اگر وہ تعویذ کی اہمیت ثابت کرنیکے لئے یہ دعویٰ نہ کرتے کہ اُس تعویذ کے اور بھی بہت سے خواص ہیں، چنانچہ احتباس طمث کیلئے بھی اکسیر ہے، ابھی کسی عورت کے ہاتھ میں باندھ دیجئے سیلان دم شروع ہو جائے گا"

یہ سننے کے بعد ضبط میرے اختیار سے باہر تھا، میں خاموشی کے ساتھ اٹھا (میرا گھر بالکل قریب تھا) اور اپنے یہاں کی خادمہ کو لے آیا اور بولا کہ:-
"لیجئے حکیم صاحب یہ حاضر ہے اپنا تعویذ باندھ کر سیلان دم کا تجربہ کرائیے" حکیم صاحب کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ اس جلسہ میں کسی نے ان کا تعویذ نہ لیا اور مجھے دل ہی دل میں بُرا کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ گئے۔

ان کی طبابت کا سب سے زیادہ دردناک واقعہ جو میرے علم میں آیا یہ تھا کہ ایک نہایت ہی نیک نفس شخص جو ریاست کے ایک ذمہ دار افسر تھے حکیم صاحب کے فریب میں آ گئے اور دواؤں کا استعمال شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان کا دماغ خراب ہوا اور پھر تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ انکی موت کے بعد ان کے بیوی بچّوں کی جو حالت ہوئی اور جس سختی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ناقابل بیان ہے۔

ناظم صاحب ہفتوں ان کے پاس رہتے اور دوائیں بنانیکے بہانہ

سے خوب انھیں لوٹتے اور آخر کار یہ غارت گری اس حد تک بڑھی
کہ ان کی جان بھی اس کے نذر ہو گئی

ناظم صاحب کے چلے جانے کے بعد باوجود اس کے کہ میں
نے بہت کچھ حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا۔ بعض لوگ ایسے تھے
جو اب بھی اُن کی خلوص و صداقت کے قائل تھے۔ لیکن جب میں نے
انھیں یتیم خانہ کے صدر اعظم کی ایک تحریر ناظم صاحب کے نام دکھائی
(جو ان کی روانگی کے بعد موصول ہوئی تھی اور پوسٹ مین غلطی سے
مجھے دے گیا تھا) تو یہ پردہ اور زیادہ اُٹھا۔ اس تحریر میں
درج تھا کہ :۔

"آپ نے جو رقم وہاں جمع کی ہو اُسے فوراً اپنا حق ۲۰ فیصدی
وضع کر کے بھیجد یجئے"۔

ناظم صاحب نے یتیم خانہ کی رقم جمع کی یا نہیں ؟ اس کا حال تو پوری
طرح معلوم نہیں، لیکن یہ بات ضرور سب کے علم میں ہے کہ اس کے
چند دن بعد ہی ان پر خیانت کا مقدمہ چلا۔

ایک سال کے بعد پھر وہ رونما ہوئے تھے، لیکن اس مرتبہ ان کا مرتبہ
زیادہ بلند تھا کیونکہ بجائے ملازمت کے انھوں نے خود اپنا یتیم خانہ
قائم کر لیا تھا اور اس کے مہتمم اعلیٰ اور مالک و مختار کی حیثیت سے دورہ

فرما رہے تھے۔ مدعا یہ ہے کہ پہلے تو انھیں سو روپیہ میں تیس روپیہ ملتے تھے لیکن اب وہ سب کے مالک تھے اور نہایت اطمینان سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے، کیونکہ اب یہ بھی خوف نہ باقی رہا تھا کہ اُن سے حساب کا مطالبہ کیا جائے گا۔

بنام جاندار جان آفرین

حکیم سخن در زبان آفرین

بنام جاندار جان